اِکرام خاور

نام : اکرام الحق

قلمی نام : اکرام خاور

والد کا نام: ابرار الحق (مرحوم)

پیدائش : 1960

چوراؤں، گوپال گنج (بہار)

پیشہ : بینک ملازمت

سروکار : دیدہ، دل اور دنیا

شغل : خواب نیم روز (Day Dreaming)

اور شاعری۔ تقریباً تین دہائی قبل

شاعری کا آغاز۔ 'ذہنِ جدید'،

'سوغات'، 'عصری ادب'، 'شاعر'

'شب خون'، 'آج کل' اور 'ارتقا' میں

نظمیں شائع ہوئیں۔ سیاسی و سماجی

موضوعات پر انگریزی رسالوں میں

کئی مضامین چھپے۔ پہلی کتاب

"مسندِ خاک" 2001 میں شائع ہوئی۔

ای۔میل : ekramkhawar@gmail.com

لہو سے چاند اُگتا ہے

اکرام خاور

لہو سے چاند اُگتا ہے

اکرام خاور

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

نام کتاب	:	لہو سے چاند اُگتا ہے
شاعر	:	اکرام خاور
ای میل	:	ekramkhawar@gmail.com
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس دہلی
سرورق	:	ثمر آتش
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Lahu Se Chand Ugta hai
by **Ekram Khawar**
2nd Edition : 2019
1st Edition: 2018 ₹250/-

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی ہند، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

ہمزاد

شاہد انور

کے نام!

Little moths stagger quivering out of the hedge;
they will die tonight and will never know
that it wasn't spring.

—Rilke

فہرست

خونیں چاندنی

یہ تو اکثر کہا جاتا ہے کہ شاعر اپنے عہد کا ضمیر ہوتا ہے مگر اکرام خاور کو اس منصب تک پہونچنے کے لیے اپنے آپ سے اور اپنے اندر کے شاعر سے نفرت بھی کرنا پڑا۔ یہ اتنی بڑی قیمت ہے کہ اُسے چکانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

ہر بڑی شاعری دلدل میں چپّو چلانے کے مترادف ہوتی ہے مگر اکرام خاور کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ دلدل سیاہ بھی ہے۔ ایک بلیک ہول کے مانند (بلیک ہول اُن کی ایک نظم کا عنوان بھی ہے)، اس دلدل میں روشنی تک جذب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی مجھے یہ شاعری، شاعری نہ محسوس ہو کر ایک سزا محسوس ہوتی ہے۔ اپنے عہد کا ضمیر بن کر جینا۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی۔ یہ سزا دیکھ لینے کی ہے۔ شاعر نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ کچھ اس دنیا میں اور جو باقی بچا وہ خوابوں کی دنیا میں دیکھ لیا۔ اکرام خاور کے یہاں خواب دیکھنے کی سزا کچھ زیادہ ہی ہے۔ اسی لیے اِن نظموں میں، ایک پیلا غصّہ اور ایک اُداس جھلاہٹ کے تیور بڑے صاف نظر آتے ہیں۔ وہ اس دنیا کی بے رحمی، بے انصافی اور لایعنی پن کو بڑی آسانی کے ساتھ خواب کی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں لفظ ہاتھ باندھے اُن کا استقبال کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے لفظ نئے اور پرانے دونوں مگر وہ شاعر کے خواب سے اتر کر جب کاغذ پر آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی قدیم اور

پُراسرار رسم الخط کو پڑھ رہے ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ہندی کے ممتاز ناقد واگیش شُکل نے کہاتھا:

''کسی شاعر کی زبان کو سمجھنا قدیم رسم الخط کے پڑھنے سے ملتا جلتا ہے اور جب اسی کے لیے مناسب محنت کرنے کی قوت یا دلچسپی نہیں ہوتی تو یہ کہہ کر کام چلالیا جاتا ہے کہ اِس رسم الخط میں وہی لکھا ہے جسے پڑھنے کی ہمیں عادت ہے۔''

میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جسے مارسل پُروست نے رُوح کی عبارت کہاتھا۔ اکرام خاور کی تمام شاعری اُن کی رُوح کی عبارت ہے۔ وہ اپنے گہرے وجودی مسائل کو جس کمال خوبی کے ساتھ سیاسی مسائل میں بدل دیتے ہیں، اُس کی کوئی مثال میں نے اب تک اُردو شاعری میں اس انوکھے انداز میں نہیں دیکھی۔ میں مثالیں دینے سے کترا رہا ہوں کیونکہ لہو سے اُگتے ہوئے چاند کی میلی بھوری چاندنی، میں ہمارا کپکپاتا ہوا وجود، اِس کتاب کے وسیلے سے، ہمارا مقدّر تو آخر بن ہی چکا ہے، مثالیں تو میں پیشہ ور ناقدوں کے لیے چھوڑ رہا ہوں کیونکہ ان کا کاروبار اس کے بغیر نہیں چلتا۔ انھیں ثابت کرنا ہوتا ہے جبکہ اُنھیں نہیں معلوم کہ تشریحی قضایا (Analytical Propositions) صرف منطقی طور پر اور صرف زبان کے اندر ہی سچّے ہوتے ہیں، زبان سے باہر نہیں۔ مجھے خود بھی اپنی باتوں کے سچ اور سچّے ہونے پر کوئی اصرار نہیں، مگر میں یہاں تشریحی قضایا پیش نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک شاعر کی اندھیری دنیا کو ٹٹول ٹٹول کر محسوس کر رہا ہوں۔ ایک قاری، شاعری کا قاری اِس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا۔

اکرام خاور کی شاعری اپنے عہد کے انتشار کو، تاریخی شعور کے ساتھ، توڑ کر باہر نکلنے اور اُس انتشار کو دور سے دیکھنے سے عبارت ہے (حالانکہ تاریخ اب ایک لوک کتھا میں بدل چکی ہے) بظاہر یہ ایک قولِ محال نظر آتا ہے مگر کیا شاعری بجائے خود ہی ایک قولِ محال نہیں ہے۔

دلدل میں چپو چلانے کے مترادف!

اپنے عہد کے اِس روحانی، اخلاقی اور سیاسی انتشار سے باہر آنے کی کوشش، اور خاص طور پر ملکی سیاست پر، ایک طنزیہ اور احتجاج سے بھرا ہوا لہجہ اِسی قولِ محال کی دین ہے جو اکرام خاور کی شاعری کو ہم عصروں میں بے حد منفرد و ممتاز بناتی ہے، مگر حیرت زدہ کردینے والی بات یہ ہے کہ اُن کے یہاں سیاسی اور ملکی مسائل کسی ناقابلِ فہم کرشمے کے تحت، بہت خاموشی کے ساتھ، مابعد الطبیعیاتی اور وجودی مسائل میں بدل جاتے ہیں اور مجھے بار بار میلان کنڈیرا یاد آنے لگتا ہے جس نے کہا ہے کہ ہماری ذاتی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو حماقتیں ہماری انفرادی زندگی سے منسلک ہیں وہی حماقتیں ہماری اجتماعی زندگی کی بھی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اِس مقام پر مجھے ایک بات اور کہنا چاہیے حالانکہ اب اِس طرح کی بات کرنے کا فیشن نہیں رہا کہ اکرام خاور مجھے اپنی تمام آفاقیت کے باوجود مجھے بہت زیادہ بلکہ سب سے زیادہ ''ہندوستانی شاعر'' نظر آتے ہیں (میں یہ بات اِس عہد کے تناظر میں کہہ رہا ہوں)۔ اکرام خاور کے یہاں ہندوستان۔ آج کا ہندوستان اپنی سیاسی اور اخلاقی بدعنوانیوں کے ساتھ) اور خاص طور پر شہری زندگی کی بے حسی اور انارکی کے ساتھ، بڑی بے رحمی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کسی شاعر کے یہاں اگر ایسی تخلیقی اور معنی خیز بے رحمی پیدا ہو جائے تو پھر، اِس شاعری کا حق۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگا کر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شاعری ہمارے حواس اور اعصاب سے کچھ مختلف قسم کے ردِّ عمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ مطالبہ اگر پورا نہیں ہوتا تو ایک حساس قاری کے حواس و ادراک پر فالج گر سکتا ہے۔ لکنت مگر خاموشی سے بہتر ہے۔ اس لیے کم از کم میرے لیے تو اکرام خاور کی نظمیں، مجھے شرمندہ کر دینے والے ایک آئینے کی طرح بھی ہیں۔ میں اِسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ میرے

دوست نے مجھے وہ آئینہ فراہم کیا جس میں میں اپنا شرمندہ چہرہ، اور اُس رُوح کو بھی دیکھ سکتا ہوں جسے شاید لقوہ مار گیا ہے۔ آج کے زمانے میں کسی شاعر کا اِس سے بڑا کارنامہ کیا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ یہ اور بات کہ بقول مارکیز، سرکاری مؤرخ اپنا اپنا کوڑا دان لیے کہیں بھی گھومتے پھریں۔

ایسا نہیں ہے کہ اکرام خاور کے یہاں محبت کی نظمیں نہیں ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ محبت، نفرت، سیاست، غصّہ، ملال اور مابعد الطبیعیات تقریباً ہر نظم میں آپس میں اِس طرح گندھ گیے ہیں کہ انھیں الگ الگ کر کے دیکھنا اور دکھانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ کام اُن شاعروں کے بس کا نہیں ہے جو کسی اونچے منبر پر کھڑے ہو کر محبت کے گیت گاتے ہیں اور خود کو نرگس کے پھولوں سے سجاتے ہیں۔ ایسی نظمیں لکھنے کے لیے اپنے آپ سے نفرت کرنا ضروری ہے اور اِس مقام پر آتے آتے شاعر کو اپنے اندر کے ملامتی صوفی سے بغل گیر ہونا واجب ہو جاتا ہے۔

محبت کو، بلکہ کہنا چاہیے کہ محبت کی یاد کو، تاسف کے ساتھ دیکھنا اور یاد کرنا، اِس یاد کے وسیلے سے خود اپنے وجود کے چیتھڑے چیتھڑے کر دینا اور لہو کی اِن بوندوں کی بنتی ہوئی لکیر پر چلتے چلتے، اچانک ایک لق و دق ویران صحرا میں خود کو بالکل اکیلا اور تنہا دیکھنا۔ ایک ایسے شخص کی طرح جسے یک بیک ٹھگ لیا گیا ہو۔

ٹھگوں کا کیا ہے، وہ تو ہر طرف گھوم رہے ہیں۔ خود ہمارے اندر بھی ٹھگوں کا بسیرا ہے۔ وہ ہم سے، ہماری اخلاقی اور رُوحانی دولت لوٹ لینے کے درپے ہیں۔ ٹھگ ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہیں، ''تمباکو'' لانے کے لیے، ''کٹوری'' لانے کے لیے اور پھر ''جھرنی'' کا حکم دیتے ہیں۔ رسّی کا ایک پھندہ، جو پیچھے سے تمھاری گردن میں ڈالا جائے گا اور تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا۔

یہ وہ ''عالم ھُو'' ہے کہ اکرام خاور کی نظموں میں خدا بھی اُتنا ہی بے بس و مظلوم ہے جتنا کہ اُس کا بنایا ہوا انسان۔''

اکرام خاور کے یہاں ''خدا'' خدا نہ ہو کر ''خدا'' کا ایک خیال ہے۔ ڈیکارٹ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اپنے اندر خدا کا ایک Innate Idea دریافت کیا تھا۔ ایک مکمل قادرِ مطلق کا خیال جو انسان اپنے اندر خود اس لیے پیدا نہیں کر سکتا کہ وہ نا مکمل، محدود اور ناقص ہے۔ اس لے ڈیکارٹ کا کہنا تھا کہ ایک مکمل خدا کا خیال (Idea) اُس کے اندر خود، خدا نے ہی کندہ کیا ہوگا اس لیے خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ناگریز ہے، مگر اکرام خاور کا ''خدا'' ایک شاعر کا خدا ڈیکارٹ کے خدا سے مختلف ہے۔ ''خدا'' کے عنوان سے لکھی ہوئی اِن نظموں میں، خدا کے خیال کی تجسیم ہو جاتی ہے اور اُس کے دکھ، انسان کے دُکھ بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی بھی مذہب کا خدا نہیں ہے۔ یہ انسان کے ''ضمیر'' کا خدا ہے اور یہ بھی ہے کہ اِن نظموں کا خدا کسی جامد تصور یا عقیدے سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ جس خدا نے انسان اور کائنات کی تشکیل کی ہے، اگر یہی کام وہ اس زمانے میں یعنی آج کے زمانے میں کرتا تو شاید دنیا کو اور انسان کو، اتنا الجھا ہوا، اتنا پے چیدہ اور اتنا ناقص نہ بناتا۔ پھر وقت ٹھہر ٹھہر کر چلتا اور موت اپنی سیڑھیاں اتنی جلدی جلدی نہ چڑھتی۔

مگر اگر ایک ''خیال'' (Idea) پہلے ہی سے اور نادیدہ زمانوں سے نسلی طور پر ایک آرکی ٹائپ کی طرح ہمارے اندر پہلے سے ہی موجود ہے تو پھر اِس ''خیال'' یا ''تصور'' کو لگاتار دودھ پلانے کی اخلاقی ذمہ داری بھی انسان کے ہی اُوپر آ جاتی ہے۔ اِن نظموں میں اکرام خاور یہی اخلاقی ذمہ داری نبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح تجریدی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل، اکرام خاور کے یہاں، ایک سفاک چاقو کی خاموش دھار کے ساتھ سیاسی اور سماجی و معاشی مسائل میں بدل

جاتے ہیں۔ اس شاعرانہ کمال اور تخلیقی کرشمہ سازی کے لیے اُن کی جتنی بھی تعریف کی جائے، وہ کم ہے۔

دراصل معاملہ یہ ہے کہ شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے اور انسانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی شے کو اور نہ ہی خود اپنے آپ کو کلّی طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کی نظر میں ہی یہ نقص ہے کہ وہ کائنات اور کائنات میں شامل ہر شے کو بانٹ بانٹ کے، ٹکڑے کر کے ہی دیکھ سکتی ہے۔ جے کرشنا مورتی نے کہیں لکھا ہے کہ ہم خود کو تو منظم سمجھتے ہیں مگر باقی دنیا کو غیر منظم اور انتشار سے بھری ہوئی۔ ہم نے ''خدا'' یا پر آتما کی ایجاد اِسی لیے کی ہے کہ ہم اُس سے یہ توقع اور لو لگائے رکھتے ہیں کہ وہ اِس انتشار اور اس گڑبڑ جھالے کو دور کرے گا اور غیر منظم کو منظم میں بدل دے گا مگر یہ ایک وہم ہے اور انسانوں کے دکھوں کا علاج کبھی نہیں ہوگا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں (اور سب تو کر کے دیکھ لیا۔ انقلاب کے گیت گا کے بھی دیکھ لیا) کہ ہمارے اندر اور باہر جو کچھ بھی ہے، اُس کے تئیں مکمل طور پر چوکنے ہو جائیں۔ اپنے عہد کے مصائب اور دُکھوں کا شعور حاصل کریں۔''

اکرام خاور کی ساری شاعری اپنے عہد کے مصائب کو سمجھنے، محسوس کرنے اور پھر اُس میں شامل ہونے کا ایک ایماندارانہ عمل ہے۔

مگر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ شاعری ہے، شاعری کی صداقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اُس کی اپنی شرطیں ہوتی ہیں، اِس لیے ممکن ہے کہ جو دنیا اکرام خاور ہمیں دکھاتے ہیں، وہ کسی کے لیے اُس دنیا سے مختلف ہو جو ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے ہے اور اُس میں جیے جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ لکھتے تو بہت لوگ ہیں مگر شاعر کیسے لکھتے ہیں؟ شاعر اپنی دنیا اپنے آپ بناتا ہے۔ اِس دنیا کے عناصر اور اجزا اُس کے لیے علامتیں ہوتی ہیں۔ یہ علامتیں صرف لفظ

ہیں۔ وہ اِس ٹھوس دنیا کو لفظوں میں بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ شاعر کی دنیا ہی اصلی اور ٹھوس دنیا ہو۔ ابھی انسان کو اپنی لغات بدلنے کا کام بھی کرنا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے مگر ابھی ہم نے یہ شروع نہیں کیا۔

نفسِ مضمون (اگر نفس مضمون نام کی کوئی شے ہوتی ہے) کی طرف آتے ہوئے، مجھے اب یہ بھی کہنا چاہیے کہ بلکہ شروع میں ہی کہہ دینا چاہیے تھا کہ اگرچہ اکرام خاور نے اپنے والد کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ مگر مجھے تو اُن کی ساری شاعری ہی ایک نوحہ محسوس ہوتی ہے۔ اپنے زمانے اور اپنے وقت کا نوحہ اور خود اپنی ذات کا نوحہ، اگر ہم اِس نوحہ کو سُن کر بھی اپنی آنکھوں میں خون کے آنسو نہیں پیدا کر سکتے تو ''لہو سے اگتے ہوئے چاند'' کی خونیں چاندنی میں کوئی سایہ گل ہمیں ''افق'' نہیں نظر آسکتا اور نہ ہی ہماری رُوح کے بحر بیکراں میں کوئی مدو جزر پیدا ہو سکتا ہے۔ صرف ایک بے حس خاموشی ہمارا مقدر ہے مگر جہاں سے خاموشی ختم ہوتی ہے۔ آرٹ اور شاعری کا وہیں سے جنم ہوتا ہے۔ اکرام خاور، کو شاعر کو، اِس خاموشی کی سفاک چادر کو کاٹنا ہی تھا۔ سو اُس نے یہی کام کیا ہے۔

بودلیر اپنے عہد اور اپنی تہذیب کے روحانی اور اخلاقی زوال سے ہمیشہ گھبراتے رہے اور نظمیں لکھتے رہے مگر ایک بار تو وہ اتنا گھبرا گئے کہ انھوں نے ''جہاز'' کے بارے میں ایک نظم کہہ ڈالی۔ یہ ''جہاز'' وہ تھا جو جدید تہذیب اور سیاسی گندگی کو کسی کنارے یا ویران جزیرے پر چھوڑ کر سمندر کی بیکراں دنیا اور موجوں میں آگے ہی بڑھتا رہے گا۔ مگر ایسا ''جہاز'' کبھی نہیں آیا نہ کسی بندرگاہ پر اور نہ کسی جزیرے پر۔ بودلیر زندگی بھر جہاز کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں نے یہ سطریں کیوں لکھیں۔ مجھے بالکل بھی نہیں معلوم، اپنے دوست کی کتاب پر لکھتے ہوئے، مجھے اِتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ میں رسمی قسم کے مضمون اور تبصروں سے اپنا پنڈ چھڑا سکوں، ورنہ کیا مجھے نہیں معلوم کہ اس کتاب پر ایک

مختلف اور بالکل دوسری طرح سے بھی لکھا جا سکتا تھا۔ میں بھی لکھ سکتا تھا اگر اکرام خاور
میرے دوست نہ ہوتے۔ اگر اکرام خاور، خورشید اکرم اور میں کسی بیتے ہوئے وقت کی دلّی
کی اندھیری راتوں میں، ساتھ ساتھ ہنس اور رو نہ رہے ہوتے تو یہ مضمون دوسری طرح سے
بھی لکھا جا سکتا تھا۔

میں اکرام خاور، خورشید اکرم اور اپنے آپ کو اس شعری مجموعے کی اشاعت کے لیے
مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

—— خالد جاوید

۳۱/اگست ۲۰۱۸

عرضِ شاعر

شاعری، شاعری کی سحر انگیز موجودگی و عدم موجودگی، مجھے خود سے ہم آمیز نہیں ہونے دیتی۔ ہر لمحہ مجھے خود سے دور کرتی چھینتی ہوئی، کسی شدید جذباتی، روحانی تجربے کی اَن مٹ نشانیوں کی مانند دل و دماغ پہ پیر تسمہ پا کی طرح سوار رہتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں کسی اور چیز کے اہل نہیں رہا۔ نشاط، غم، روز مرہ، محبت، نفرت، سیاست، زندگی، موت، جاگ، بھاگ، خواب، چپے چپے پہ اس کی حکمرانی ہے۔ اور میری مجموعی بساط تیز آندھی میں گرفتار ایک خشک پتے سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کمالِ حیرت و تاسف کہ اس تقریباً مکمل غلبے اور موادِ خام کی بے جواز و بے پایاں ابتری و بربادی کے باوجود، حقیر سا سرمایہ شاعری ہی مہیا کر پایا ہوں، جو حاضر خدمت ہے۔ اچھی، بری، شاعری، متشاعری، غیر شاعری وغیرہ وغیرہ کی اصطلاحات قارئین و ناقدین جانیں ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ لفظ بذاتِ خود اپنا جواز ہے اور لکھنا دراصل روز اپنا لازمی بیان لکھنے اور کسی گہری کھائی میں پھینکنے کا عمل ہے۔ تقریباً اتنا ہی عبث، بے جواز و لایعنی جتنی کہ خود انسانی ہستی۔

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ دہر
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

اکرام خاور

10/اگست 2018

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

مُفتیٔ شہر کے بنگلے سے متصل
فٹ پاتھ سے گذرتا ہوا وقت
گذرتا چلا جاتا ہے
اور وہ کھڑی رہتی ہے
دیکھتی، بھرپور نگاہوں سے تولتی ہوئی
گذرتے ہوئے وقت اور راہگیروں کو
گل مہر کی آگ لگی شاخوں تلے
بے باک نگاہوں کے تیز،
گرم چاقو سے کھُرچ کھُرچ کر
کچھ تلاش کرتی،
کبھی بے اعتمادی سے،
ساری کے پلّو میں انگلیاں مروڑتی
پسینے اور شرم سے شرابور
سخت فٹ پاتھ پر کھڑی

زندہ،
زمین میں دھنستی ہوئی!

کبھی، کبھی، تو
وہ کھڑی رہتی ہے
بڑی دیر تک!
ستاروں کے،
ڈھل جانے تک!
سمندری ہوا کے،
معتدل ہو جانے تک!
چاند کے گرد بنتے ہالے کے
دبیز تر ہو جانے تک!
مندر کے پجاری کے
سو جانے تک!
آسمان سے مسلسل برستی،
نادیدہ بارش کے
تھم جانے تک!

رات کے آخری ٹرام کو
الوداع کرتی ہے وہ

اکثر، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے
گذرتا ہے کوئی
اس کی بغل سے

اک لمحے کو ٹھہر کر دیکھتے ہیں
دونوں، اک دوسرے کو
گہری محبت اور
ہمدردی سے
شب زادیٔ شہر
اور
شاعر!!

انتباہ!

زندگی گو ہر قدم اک جنگ ٹھہری
رحمِ مادر سے،
زمانے کی طرف پہلا قدم
اوّلیں وہ مضطرب آوازِ گریہ
اِس مسلسل جنگ کا
باضابطہ اعلان ٹھہرا
نیم روشن، ملگجے کمرے کی خاموشی میں
آنکھیں کھولنا
اور تابِ نظارہ کی جرأت ڈھونڈنا
اور دست و بازو تولنا
اور بال و پر کا پھڑ پھڑانا
سانس لینا، چیخنا، چلّانا
پیروں پر کھڑا ہونا

اندھیری اور سرکش طاقتوں کے بالمقابل
فتح کا باضابطہ اعلان ٹھہرا

پھر بھی لازم ہے
مرے ساتھی
جنھیں لڑنے کی ضد ہے
لڑیں
اور یاد رکھیں کہ
قوی اور چھوٹے پیمانے کی جنگوں میں
بہت خطرات ہیں جان وجگر کے
اور اگر نم ہو زمینِ جنگ تو
ہر گام آہوں اور اشکوں سے لبالب راستے ہیں
جا بہ جا رنجے ہیں، خندق ہے!

بھوک کی بنیاد کیا ہے
قحط کی میعاد کیا ہے
کس لیے پڑتا ہے پالا
کس جگہ گرتی ہے بجلی
نل سے پانی کیوں نہیں آتا

ظلم ہے ایجاد کس کی

آج کیا بارش کا مطلب ہے

دھوپ اتنی تیز ہے کیوں

ناک کیوں ٹیڑھی ہے اس کی

اس قدر بے نور کیوں ہے مجمعِ خلقت

اف خدایا!

کس قدر فربہ ہے اُس کا جسم

اُس احمق کے چہرے پر شکن کوئی نہیں کیوں کر

دیکھنا!

اُن کولہوں کی نخوت!

زمیں اب تک جو ایسی گھومتی ہے

ایسی بے ڈھب چال سے

کیوں گھومتی ہے!

مرے ساتھی

جنھیں لڑنے کی ضد ہے

لڑیں، باور رہے لیکن

مسلسل چھوٹے پیمانے کی جنگوں میں

ہنر مندی سے اور حکمت سے زیادہ

خونِ دل کی چاشنی ہے
دانت اور لوہے چبانے کی روایت ہے

طرۂ افسوس یہ کہ
ایسی بے ڈھب اور بے مطلب کی جنگوں میں
کوئی ہیرو نہیں ہوتا
شہادت کا کوئی رتبہ نہیں ملتا
کہیں شانِ تجلّی کے نقوشِ پا نہیں ملتے

مرے ساتھی
جنھیں لڑنے کی ضد ہے
لڑیں

اور یاد رکھیں!!

مرثیہ

پھر اک دن ایسا آئے گا
دھند بھری، اور بھید بھری
اک گہری، کالی رات سے ہوتا
سونے اسٹیشن سے، میدانوں سے ہوتا
بھور کی پہلی ٹرین سے
میں واپس آؤں گا!

پار کروں گا
پیدل پار نہ ہونے والا
لمبا اور سونا اسٹیشن !

صبح کی لالی
اور ندی کو
پار کروں گا!!

یوں بھی

میرا کیا ہونا تھا

دنیا

خالی رہ جانی تھی!!

دنیا

خالی رہ جائے گی!!

(ابا کی وفات پر)

رفتگاں! رفتگاں!

بڑے سج دھج سے آیا
موسمِ کشتۂ نگاراں
شہر میں اب کے
ہوائیں خوں چشیدہ
بام و در کو چاٹتی
دیوانہ وار آئیں
ہوئیں ویران
دل کی بستیاں ساری!

خرابہ رہ گیا باقی
رہا نام خدا باقی

خرابہ بولتا سا، گونجتا سا
گونجتی سی اذن خاموشی
یہ کس سفاک، سحر سامری کا شاخسانہ ہے

کہ مئے خانے میں بادہ،
جام، خم، ساغر نہیں باقی
نہ فیضِ دستِ ساقی ہے
نہ مئے خانے کا در باقی
کہاں سے لایئے رفتار وہ گفتار
وہ حسنِ سراپا، وہ رخ روشن
کہاں سے لایئے وہ دست و ناخن
وہ حنائی دل کا پیراہن!
کہاں سے لایئے
مژگان و ابرو، چشمِ مستش
جادوئے پرنم!

ہٹاؤ کھینچ لو یہ پیرہن
یہ جسد خاکی کا بھرم
یہ مرقدِ ہستی!!
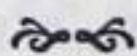
(والدین کی وفات پر)

اندوہِ بیاباں!

وہ تمام چٹھیاں جو مجھے لکھنی تھیں
اور جنھیں میں لکھ نہیں پایا
وہ تمام عہد و پیمان جو مجھے کرنے تھے
اور میں کر نہیں پایا
وہ سارا فراق و وصال
وہ سارا فاصلہ جو میں طے نہیں کر پایا
وہ سارا درد، وہ ساری شرابیں
میں جس کا اہل نہیں ہو پایا
وہ ساری داستانیں، گونجتی ہوئی
جنھیں میں رقم نہیں کر پایا
وہ سارے گستاخ و آوارہ، بوالہوس بوسے،
جو لب بستہ زنجیروں کی قید سے آزاد نہیں ہو پائے
سینہ بہ سینہ،
لب بہ لب،

زانو بہ زانو،
وہ تمام بے تاب ہم آغوشیاں
تموّج پیچ وخم سے پُر،
گرجتا، لہلہاتا، تیز اور سرشار دریا
جو رگ وپے کی قید و بند سے
آزاد نہیں ہو پایا!

لہو کا سارا کس بل
جسم کی بھونچال
فنا ہوتا ہوا
پاتال میں گرتا ہوا
ایک بھاری پتھر!!!

ذائقہ

حسرتِ یاقوت لب
اور اپنا بحر بیکراں لے کر
کہاں جاتا
یقینی طور پر
میں مبتلائے مرضِ ہستی تھا
یقینی طور پر
ہر ہر بنِ ومُو سے
رگ وریشے سے
موجِ مرگ کا چشمہ ابلتا تھا
یقیناً روئے زیبا
استخوانِ خاک تھا
چشم سیاہِ مست
چلمن تیرگی کا

دھڑکتے دل
مچلتے خون کی ملہار کے پیچھے
گرجتی زندگی اور
مَوت کی پیکار کے پیچھے
عناصر پر مسلسل
مَوت کا پہرہ تھا

بوسوں سے
اجل کی باس آتی تھی!!!

لڑکیاں!

شوخ و شنگ لڑکیاں!

رنگین تتلیوں، پتنگوں کی مانند تیرتی
چار دانگ عالم میں
دَف سی بجتی
مِردَنگ سی گونجتی
ہوک سی اُٹھتی
اَنی سی چُبھتی
کومل گندھار سی
دلوں کو چاک کرتی
لڑکیاں!

دھان کی بالیوں
اور نبولیوں سی پکتی
گڑ کی شراب سی کشید ہوتی

وقت سی بھاگتی، عمر سی بچتی
کانٹوں سی سوکھتی
پھولوں سی کِھلتی

مرتبان میں بند
اچار سی پکتی
سکوں سی کھنکتی

میدانِ جنگ سی للکارتی
فصلوں سی لہراتی

الگنی پہ
سوکھتی ہوئی لڑکیاں!

لڑکیاں
جن سے میری دنیا آباد تھی
مسکراتی، کھلکھلاتی گذرتی ہیں
پنساری اور قصاب کی دکانوں سے
دامن بچاتے ہوئے
عجلت اور سنجیدگی سے

میرے سونے کا قلعہ تھیں
لڑکیاں!

جن کے بغیر
میرے جسم میں کانٹوں کی کاشت ہوتی ہے
اور ملاحت روٹھ گئی ہے مجھ سے
سینہ کوبی کرتی زمیں
پکارتی ہے بار، بار
لگاتار
ان معصوم وخوش خلق
لڑکیوں کو

قبر کھودے جانے کے دوران
لڑکیاں منتظر تھیں
آم میں انبولوں کی
ساون میں گیتوں کی
موسیقی میں سرگم کی
انتظار کے موسم میں
لڑکیاں منتظر تھیں
شہزادوں کی!

شہزادے
شہدوں کے ہمزاد

زیرِ زمیں تھے
اور زمیں پر
خودرو پیڑوں کی مانند
اُگ رہی تھیں لگاتار خودکار
لڑکیاں!

گھر اور جنت کی تعبیر
عافیت اور ہجرت کی تعبیر
اندھیارے، متلاطم سمندر کی پُرشور
آندھیوں کے بیچوں بیچ
شام کا روشن ستارا تھیں
لڑکیاں!

لڑکیاں
جن کے بغیر دنیا
ایک بنجر سیارے میں تبدیل ہوئی جاتی ہے

لڑکیاں، لڑکیاں
لڑکیاں!!!

راج رشی (۱)

راج رشی!
مہاراج!
بتاؤ کیسے پریت نبھاؤ گے
کھیل رہے ہو ہولی، لیکن
کب تک کھیلتے جاؤ گے

پکّے رنگوں کی اک ہولی
آئی تھی، آکر بیت گئی
تم کھیل چکے یاروں کے سنگ
سب رنگ، ابیر، گلال
اب آنے والی ہولی میں
تم کون سے رنگ لگاؤ گے
تھک جاؤ گے

تھک جاتی ہے
جوش میں آئی رقاصہ
تھکتا ہے
بیساکھ کا سورج
ماگھ کا پالا
تھک جاتی ہے گنڈک، کوسی
رات اماوس کی کالی، اندھیاری اور
بندوق کی نالی
تھک جاتی ہے
پھٹ جاتی ہے!!
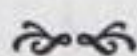
راج رِشی (۲)

راج رشی ! مہاراج!
تمھاراوَستر دُھلا، اُجلا، اُجلا
تن چوکس ہے!
انکھیاں کالی، کجراری
چتون چنچل، من وِہوَل ہے
ساگر، اتھاہ . . .
ماتھے پر تیج تپسیا کا!

راج رشی ! مہاراج!
کہاں سے لائے ایسی
بانکوں جیسی آن بان
جوگی سی یہ نرمل کایا
یہ مستک لال وِراٹ!
تلک کیسا سجتا ہے!

یگ رَماتا، بھاشاوِدھ

وِدّوان، کوی، اِتہاس کار

یودھا، مہنت

بھارت کے بھاگیہ وِدھاتا تم

میں ابلاناری، واری تم پر

مرجاؤں!

مرمرجاؤں!

جن گن من ادھینایک جئے ہے . . .!!
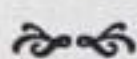
''گجرات''

جب عاشق خنجر پونچھ، پونچھ کر
معشوقوں کی زلفوں سے

سیراب ہوئے
اور پُروائی کی بیلا میں
سکھیوں کے بدن، لوبان ہوئے

تب!
گیان، دھیان کی دھرتی پر

ہر، ہر جانب سے
خوں سے معطر

بادِ صبا
سودائی سی!
حیران پھری!
حیران پھری!

اُس پار سمندر ہے لیکن
'گجرات' کو کیسے پار کروں!!

حیرت کدہ

زمیں پر کان رکھتا ہوں
ہواؤں، آسمانوں کے رخوں پر
دھیان دھرتا ہوں!

عجب مشاقئ فن ہے
دکھائی کچھ نہیں دیتا!
سنائی کچھ نہیں دیتا!
اگرچہ بازی گر
انصاف کی عشوہ گری کے ساتھ
خونیں رقص کی روداد لکھتا ہے!!

محبت

محبت!
دل کے تہہ خانے میں
بھاری، ڈوبتے، کائی لگے پتھر کی تہہ میں
دُوب کی مانند اُگتی
اور زمیں کی ناف میں
لاوے کی صورت
پکتی رہتی ہے!

ہوا
قُطبین کے مابین
بہتی ہے!
زمیں پر فصلِ گل کی باڑھ آتی ہے!
لہو سے چاند اُگتا ہے!
صنم کے ہاتھ کھلتے ہیں!

محبت خون کی پیکار و آمیزش!!

زلفِ پریشاں

اُس جانب کہ
شہدے، شہر کے چوک میں بیٹھے
غازہ اور بغداد سے لے کر
بامیان کے گونگے بدھ پر
گولوں کی بارش کرتے تھے
اور اِس جانب
زلف پریشاں کی اک لٹ کو
سلجھانے میں
عمریں بیتی جاتی تھیں

اور عمریں بیتی جاتی ہیں!!

نظم

میرے لیے چند باتیں طئے کرلینا
نہایت ضروری ہے
مثلاًیہ کہ حاملہ بیوی کو
'ستیہ میو جیتے' اور
'مریاداپروشوتّم رام'
کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا بہتر ہے یا
گولی مار دینا

یہ بھی کہ گولی
اس جسم نازک کے
کس نازک اور مہلک حصے پر
مارنی ہوگی!
اس آخری گھڑی میں،
کیا اسے چومنا بھی ہوگا!

اس گرتے ہوئے جسم کو،
زمین پر گرنے سے پہلے،
کیا تھامنا بھی ہوگا
بند کمرے کی فضا میں یا
کھلے آسمان کے نیچے!

میرے پاس
کیا ایک فالتو گولی بھی ہوگی؟

بالفرض! میری بیوی اگر نئی نویلی بیاہتا نہ ہو
بالفرض! اگر وہ حاملہ ہو
ویسی صورت میں
میرے لیے یہ طے کر لینا بھی
نہایت ضروری ہے کہ
اپنے ہونے والے بچے کے لیے
میں کیا نام تجویز کروں
اس ملک اور
اس کال میں!!

کیسے مار سکتے ہو تم مجھے!

کیسے مار سکتے ہو تم مجھے!
مجھ میں کھیت، کھلیان، ہاٹ، بازار
ہیرا، موتی کے گلے میں بجتی ہوئی
گھنٹیوں کی آواز،
اور ہندوستان کی روح بستی ہے
سرسوں، کپاس، باجرا
مڑوے کی روٹی، مہوے کا پراٹھا،
عیدگاہ، قبرستان، شوالہ اور شمشان ہے
'متھرا کاکا' کا پوپلا ہوتا ہوا منھ ہے، اور
اُن کا من موجی بیٹا 'رم کشنا'
اور 'بھکاری ٹھاکر' کا ہم عصر و ہم پیشہ
'رسولوا' کی دنت کتھا ہے!
گیند کی طرح گول ہوتا،
دانت سے لاٹھی اٹھاتا،
ناچ، ناچ کر ڈھول بجاتا،

گاؤں کا گونگا 'بُوکا' ہے
اور بکریاں چراتی،
خمیدہ کمر،
بڑھیا 'حدیثن'!

ہل کے ہتھے کو سنبھالنے میں ناکام،
کانپ، کانپ جاتی ہوئی،
'دکھیا' کی کایا ہے،
یک لخت بجھتا ہوا،
اس کی آنکھوں کا موہوم سا دِیا ہے
اور بھینسوں کے پیچھے بھاگتا
'پیشو بھائی'!

کیسے مار سکتے ہو تم مجھے؟
مجھ میں ساون کی کیچڑ،
ماگھ کا پالہ اور بھادوں کی بدحالی ہے!
بانس کے جنگلوں کی گنگناتی ہوئی سرگم،
اور بیساکھ کے جوہڑوں کی تپتی ہوئی
سنسان دوپہر ہے

شام کے گھنیرے سایوں میں،
تنہا، اداس، درختوں کی شاخوں تلے
پرکھوں کی کچی پکی قبریں ہیں
پگڈنڈیوں سے لوٹتے ہوئے
مویشیوں کے ریوڑ ہیں
لامتناہی آسمان کے نیچے
آنگنوں سے نکلتا ہوا
سرمئی دھواں ہے
ندی میں ڈوبتا ہوا
سورج کا لال کلش ہے

اور

'مہاویر کاکا' کی دق زدہ
کھوکھلی ہوتی
مرتی ہوئی دیہہ ہے!
کیسے مار سکتے ہو تم مجھے بھلا؟

میں، اپنی ساری خوش فہمیوں اور
لن ترانیوں کے لیے بے حد شرمسار ہوں!

اِس 'گورَ مئے'
گجرات کے بعد!!!

کٹھن سَمئے

اک گھور کٹھن سَمئے میں
جب میاں جی، بہ رضا و رغبت
بڑے مزے سے قتل ہونے میں
مصروف تھے
اور ہندوستان کے شاعر
خوف، دہشت اور بغاوت سے لبریز
نظموں کی تخلیق میں!

کوثر و تسنیم میں دُھلی دُھلائی زبان کے
یارانِ طرح دار
شمش العلماء کی صدارت میں
بہ طریق احسن
ترقی پسندی کی جھال
اُلٹی سمت سے بجانے میں مصروف تھے

اُدھر زبان
بنیادی تبدیلیوں میں گرفتار تھی
اسم، صفت میں تبدیل ہوتا ہوا
خود مختار استعارہ بننے پر مصر تھا
اور گجرات کے اس پار
خواجۂ خواجگان
ترقی پسندی کی بلند و بالا خالی مسند سے
ادب کی داد و بے داد کے ساتھ
داد، کھجلی کا اشتہار
چھاپنے میں مصروف تھے!!

دریں اثنا
تاریخ تھی کہ
کسی اور ہی شغل میں مصروف تھی!!

حال بغداد کا

حال بغداد کا ٹھیک ہے
جتنے گھر زد میں تھے
سب کے سب جل چکے
دست و بازو، جو گستاخ تھے،
کاٹ ڈالے گئے
اک تو یہ کہ فراوانیٔ حسن میں
کچھ خرابی نہ تھی
اور پھر شہر میں
بڑھتی تاریکیوں کا تدارک ضروری امر تھا
امن، آشتی کے لیے
اس لیے
جشن دوبالا ہوتا گیا
شہر میں روشنی کے لیے!

لازماً، منطقی طور پر
بعد میں، جیسے ظاہر ہوا
چند گھر اور بھی بے ضرر تھے
مگر جل گئے

غلطیہائے مضامین اپنی جگہ
پھر بھی ان کے فوائد سے انکار
دشوار ہے!

آدمیت کو درکار تھی
روشنی، امن اور آشتی
اس لیے اس مبارک ضرورت کی تکمیل میں
شر پسندوں کی تہذیب و تکذیب کے واسطے
ایسے اجسام جن میں
بغاوت کے آثار پائے گئے
آتشیں، گرم سیال میں،
ان کو غسلِ صحت دے دیا

ہوشمند و جری،
شر پسند اور گستاخ کی شرط کیا
شیر خواروں کو بھی
اور وہ، جو کہ خوش بخت تھے
آدمیت کی خاطر انہیں، رحم مادر میں
آرام، ابدی سکوں
دے دیا!

حالِ بغداد کا ٹھیک ہے

نظم

ہجر کی اس طول وطویل رات میں
آنسوؤں کا اک قطرہ بھی ضائع کیے بغیر
اپنی یہ بے وطیرہ عمر
غایت صبر وشکر سے
گزار سکتا ہوں میں!
بشرطیکہ
امید، میری دسترس سے
دور، بہت دور، نہ بستی ہو!

دل کی ویرانی
اور بے ثباتیٔ دنیا کے باوجود
سیاروں کی اس بنتی، بگڑتی انجمن میں
جوش میں آئی موجوں کے ہمراہ
ہر مغرور چٹان سے ٹکرا سکتا ہوں میں

اور ہر موج شکستہ کے ساتھ
جنگ سے لوٹتے ہوئے سپاہی کی طرح
ہارے ہوئے جواری کی طرح
لوٹتی ہوئی موجوں کے ہمراہ
ساحل کی ریت میں
بے نام ونشاں
گم ہو سکتا ہوں میں!

بدلے ہوئے موسم
اور چاند کے بڑھتے
آکار کے ساتھ
کچھوؤں کے انڈوں سے نکل کر
آسماں تک
پھیل سکتا ہوں میں!

”طالبان“

سسکتے ہیں، سمرقند و بخارا
کابل و قندھار،
ان کی راہ میں
روندے پڑے ہیں
بے بضاعت دھول کی مانند!

نگاہِ خشمگیں سے
کانپتا ہے درۂ خیبر
تڑختی گرم لاوے سی پگھلتی ہیں چٹانیں
برف کی ڈھلواں پہاڑوں پر!

حکومت ایزدی ہے
اور حکومت کے سبھی دستور ہیں
اور دم بخود ہیں

بندہ وبت

بام و در اشجار

اہل دل لرزتے ہیں

جلال ایزدی ہے اور

جلال ایزدی کے عہد زریں میں

سلیماں سر بہ زانو

تخت پر جلوہ فگن ہے

رینگتی، پھنکارتی

موج رواں!!
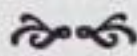
اگر چاہوں

اگر چاہوں
زمیں کو شعلہ بار اور
آسماں کو جنت الفردوس میں
تبدیل کر سکتا ہوں میں!
فلک کے سات پردوں سے پرے جا کر
کبھی مریخ کو اور مشتری کو، چاند کو،
تسخیر کر سکتا ہوں میں!

مضطرب سیارگاں کی
نبض، ہر دھڑکن کو
اک تصویر کی صورت
کسی معمولی کاغذ پر

تمھارے ناشتے کی میز پر
اخبار کی مانند لا سکتا ہوں میں!

کہکشاں کی وسعت و رفتار کے احوال جملہ
آپ کی دہلیز تک
اک نیم واضح کلیے کی شکل میں
ہر روز لا سکتا ہوں میں!
مجھے قدرت ہے
چاہوں تو درونِ خانۂ ذرّات
جو اک کائناتِ رازِ سربستہ ہے
اس کے عین دل تک
رعونت اور نفاست سے
پسندیدہ سگار مُنھ میں دبائے
روز جا سکتا ہوں
واپس روز آ سکتا ہوں میں!

میرا دعویٰ ہے
میں چاہوں تو
شب کو روزِ روشن میں
فلک کو حدِّ نظارہ میں

خوابوں کو حقیقت میں
صنم کو دِلربا میں اور
یوسف کو زلیخا میں
چمن کو آگ میں اور
آگ کو پانی میں
دجلے کو فرات اور
ذرے کو خورشید میں
تبدیل کر سکتا ہوں میں!

یونہی آتے نہیں انداز محبوبی
کہ میں قادر ہوں
اور چشم زدن میں
آپ کے رخسار و لب
آنکھوں کی رنگت
قد و قامت
آپ کی اولاد تک
ترسیل کر سکتا ہوں میں
(وہ بھی اک معمولی سی شیشے کی نالی میں!)
نہایت رازداری اور صفائی سے
تمھارے دل جگر کی جگہ

(جن کے ذکرِ بے جا سے،
تمھاری شاعری اوندھی پڑی ہے)
میں لگا سکتا ہوں
اس دست شفا سے
سُوّروں کا دل، جگر!
(اگرچہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا
کہ سُوّر آپ ہی کی نسل سے ہیں)

آپ کی چالاکیوں، عیاریوں کے بعد بھی
جس روز میرا، جب بھی دل چاہے
محض اک جنبشِ ابرو
نگاہِ یک غلط انداز سے
اِس مصر کے بازار کی
تقدیر لکھ سکتا ہوں میں!

خیر!
جب تک مصر کا بازار قائم ہے
لنڈھائیں جام، صبر و شکر سے
دھومیں مچائیں،
پئیں چھک، چھک کے خود بھی

اور یاروں کو پلائیں

کہ اپنے قبضۂ قدرت سے

بیگانہ ہوں میں

فی الوقت کچھ کرنے کو

میرا دل نہیں کرتا!
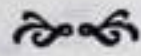
آندھی

گزشتہ شب،
کہیں اک زور کی آندھی چلی ہو گی!
وگرنہ خواب میں
مرحوم ابا
کس لئے آتے
بلکتے، ہچکیاں لیتے
مرا دامن پکڑتے، گود میں آتے !

کہیں اک زور کی آندھی چلی ہو گی
وگرنہ، خواب میں، پچھلے پہر،
کیوں میرا ابا نکا دوست
خرّم خان آتا
دیر تک ہنستا ہنساتا
دھول دھپا شوروغل کرتا

مگر جانے سے پہلے،
راز داری سے،
میرے کاندھوں میں،
بانہیں ڈال کر کہتا کہ
'یارا! اپنی تو جانے
مگر میرا تو دل اب بھر گیا!'

کہیں اک زور کی آندھی چلی ہوگی
کھلی جب آنکھ تو دیکھا
کہ دنیا
تنگ تر تھی
اور کمرہ سرد تر تھا!

بسنت

بسنت بیتتا گیا—
اور محض انتظار کرتا رہا میں
کہ کوئی آئے گا
بار بار
بصد اصرار
کہتا چلا جائے گا
سنو! سنو!
اے جنم، جنم کے بہرے
سنو! مجھے تم سے محبت ہے
تمھارے بغیر، کسی طور
جینا محال ہے!

اک طویل، بوجھل، انتظار کے بعد
اپنے سائے کو بھینچ بھینچ

رُندھے گلے سے،
زور زور سے چلاتا ہوں اب
سنو! سنو!
اے کالی کجراری نینوں والی
سنو! اے میری نادیدہ روشنی
مجھے تم سے محبت ہے!
تمھارے بغیر، کسی طور،
جینا محال ہے!

دھول اڑاتی، سیٹیاں بجاتی
گذرتی ہے ہوا!

ممتا اور محبت سے
گلے ملتا ہے مجھ سے
میرا سایہ!!

تھاگت

(ہندی کتھا کار سنجیو کی کہانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

جان دینے کو باقی کہیں کچھ نہ تھا
زندہ رہنا جبلت کی تجسیم تھا،
لوگ، کب کے سبھی جا چکے تھے
بتانے کو موجود کوئی نہ تھا
کب کہاں اور کیوں کر
میں پیدا ہوا

علم مطلق نہ تھا
کہ بطن کے اندھیرے سے
دنیا کے اجیالے تک آتے آتے
میری شکل وصورت، شباہت
گلہری کے بچے سے ملتی تھی
یا سانپ کے!

بلکہ اس وقت
اِس گرم محبوس
تپتی ہوئی سہ پہر کے گھٹاٹوپ،
سناٹے میں
سوچ پانے سے معذور ہوں
کیا کبھی ایک مجبور ولاچار بچے سا
دھرتی پہ لایا گیا!

تازہ تازہ ابھی چیر ڈالا ہے
جیالوں نے دھرتی کا پھولا بطن
تازہ، تازہ کٹی قاش سی
خوں کے دھاروں میں لتھڑی ہوئی
غیر مرئی خط استوا سے لٹکتی ہوئی
یہ زمیں
اور فضاؤں میں بھرتا ہوا
عود وعنبر سے اٹھتا ہوا
تیز، زہریلا، کالا،
دھواں!
نعرۂ حق وہو!!

دور

لوح ازل پہ

دمکتا ہوا

اسم اعظم!!!

طرفہ تماشہ

درد سے شدید تنفر کے باوجود
دراصل مجھ میں درد کی بے جا فراوانی تھی
بلاسبب ہی میں
بُری خبروں کا مسکن بن چکا تھا!
نیک طینت وزیر اعظم
اُدھر ملکی کابینہ میں
قوم کے تابناک مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا
اِدھر میں غم غلط کرنے میں!

اُدھر ناک رگڑ رگڑ کر
فرش چمکاتی مہالکشمی
روٹیوں کی مہک سے معمور
گھر کی تلاش میں!

ملک بدل رہا تھا!
تقدیریں بدل رہی تھیں!

کسان خودکشی میں مصروف تھا
حسینۂ شہر جسم فروشی میں!

مزدور خودسوزی میں مصروف تھا
شہد ے لٹیروں کو باعزت بنانے میں!
کم مایہ چور، اچکّے
دن دہاڑے
شہر کے چوراہوں پر
جل جل کر
مرجانے میں!
دانشور
الفاظ کی جگالی میں!
جوانانِ شہر
مشت زنی میں!

جسموں، تمناؤں کی ریلم پیل تھی!
حسرتوں اور تمناؤں کی آماجگاہ
اجسام، دراصل
اعضاء و اندام کی تجسیم تھے!

جوانی، جو بستر کے کام نہ آسکے
جوانی کے زمرے سے خارج تھی!!

اُداسی

اُداسی، اتنی گہری تھی
کہ سب کچھ ملتوی تھا
ملتوی تھا
مسکرانا، گنگنانا
گہری، ہلکی، نیند سونا
دست و بازو تولنا،
پر پھڑ پھڑانا
چڑیوں کے ہمراہ
گھر کی چھت سے اڑنا
آم کی اونچی، گھنی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ جانا
سب سے میٹھے پھل چرانا
دھوپ میں تپنا، تپانا
پر سکھانا!

ملتوی تھا

شام کو سجنا، سجانا

روز، اک بانکی ادا سے

شہر کے بازار میں گشتیں لگانا

گل رخوں کو دیکھنا

اور آہ بھرنا!

کسی نوخیز قتالہ کے پیچھے

دور تک جانا

کسی بھیگے ہوئے موسم میں

اپنی سال خوردہ، غم گزیدہ سائیکل پر

شہر کے چکر لگانا

تیز اور اونچے سروں میں

عشقیہ گانے سنانا!

ملتوی تھا!

دور افتادہ، کسی گمنام اسٹیشن کی سونی بنچ پر سونا

ستاروں بادلوں سے نت نئی سازش رچانا

بھرے دل سے جہاں کو دیکھنا

اور ہلکے ہلکے کش لگانا!

شام کی پگڈنڈیوں پر بے ارادہ،
دور تک جانا
گریۂ شبنم کو اپنی پلکوں پہ محسوس کرنا
دوستوں کے ساتھ
پچھلے پہر تک بحثیں لڑانا!

گجر دم، رات کی متوالی خوشبو سے معطر جاگنا
اور مشکِ شب کے سحر میں
گم گشتہ مصرعے گنگنانا

سیہ بختی کی چادر سی اداسی
اتنی گہری تھی
کہ سب کچھ ملتوی تھا
ملتوی تھا
کسی سرکش ندی کی موج سا
چٹانوں سے سر پھوڑنا
بدمست ہاتھی سا
زمانے سے گذر جانا
شرارے سا بکھرنا
اور شعلے سا بھڑک جانا

دہکنا اور بجھ جانا
سمٹنا، پھیلنا
اور پھر دمک جانا
مثالِ قطرۂ سیماب
ہر لحظہ تڑپنا اور تڑپانا
تپانا آہن و فولاد
نگینیں بنانا
بحسب حکمت و حاجت
زمیں کے محور و مرکز کو کھسکانا!!

اوس اور آنسو

اوس اور آنسوؤں میں بھگوئی ہوئی
رات کس کی تھی
میں اس کا تنہا مسافر
کہاں جا رہا تھا
چلا جا رہا تھا
بظاہر اکیلا
مگر حلقہ در حلقہ
افسوں و افسوس کے اس سفر میں
نہ آہیں مری تھیں، نہ اشکِ ہلاہل
نہ دھرتی کا پھٹتا ہوا
زہرِ آتش فشاں ہی میرا تھا
بڑھاتا تھا گو میں قدم راہِ منزل کی جانب

مگر میرے قدموں کے مابین
صدیوں پہ پھیلا ہوا
فاصلہ تھا
یہ آنسو جو پلکوں پہ اب منجمد ہیں
نہ جانے کہاں کس جگہ سے چلے ہیں!!

یہ مشک ہے کہ محبت مجھے نہیں معلوم

وہ ان کی
ہڈیوں کا لوچ تھا
یا
میری شہ رگ میں بھڑکتا
فاسفورس کا کوئی ٹکڑا!
بظاہر ناتواں، مخدوش
جسموں سے نکلتی
آنچ تھی
یا جو بہ جو بڑھتا ہوا
اک پیاس کا دریا

وہ کیا تھا
نرم و نازک جلد کے نیچے
مچلتا کوئی مقناطیس تھا
یا ماہ پارہ!

شعلہ ساماں
موجِ مئے تھی
یا لرزتی اک نہادِ کج
کہ زہرہ کا دھڑکتا دل!

وہ کیا تھا
ان کے ہونے میں کہ
ان کی یاد آتی ہے تو
پھر جانے پہ آمادہ نہیں ہوتی!

وہ کیا تھا
ان کے ہونے میں
محض اک داغ دل
یا رت جگے کا لاؤ لشکر
یا دوپٹوں سے دمکتا
شہر خیر آباد تھا

یا جلتا بجھتا
اک شرارہ!

بند مٹھی میں
ابلتی کوئی چنگاری
کہ خاکستر ہوا جاتا
بدن میرا!
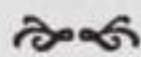
طوفانِ نوح

مسلسل تیز موسلا دھار
بارش ہو رہی ہے
شام کی سنسان پگڈنڈیوں پر
رات کی مضطرب خاموشیوں پر
زمین دوز ہوتے
گمنام جزیروں کی سربلند چوٹیوں پر
آسمان ابر میں تبدیل ہوتا ہے
ابر آنسوؤں میں
آنسو آبگینوں میں!
دور پہاڑوں پر پگھلتی ہوئی برف
گرتی ہے
قطرہ قطرہ
سینے کی گنجلک پہنائیوں میں
پرشور وادیوں کی گونجتی گہرائیوں میں!!

مسلسل تیز دھاروں دھار
بارش ہو رہی ہے
مست ملنگ جوگی کے
سر اور بدن پر!

راکھ ہے کہ اڑتی جاتی ہے
اک چتا ہے کہ جلتی جاتی ہے
اک دیا ہے کہ بجھتا جاتا ہے!!

ساحل اور سمندر

دوست، بنجر زمینوں کی مانند تھے
جن سے کچھ نہیں اُگتا
اور سب کچھ اُگایا جا سکتا تھا
دوست، سایوں کے مانند تھے
جو ساتھ ہو کر بھی ساتھ نہیں تھے
داستانی پریوں کے مانند
جن سے حیرت انگیز کارنامے
انجام دیے جا سکتے تھے
دوست یادوں کی مانند تھے
جن سے ہر مشکل آسان کی جا سکتی تھی

جہاں دنیا ختم ہوتی تھی
دوستوں کی شروعات ہوتی تھی

جہاں امید ختم ہوتی تھی
دوستوں کی محفلیں شروع ہوتی تھیں

جہاں دوست نہیں تھے
وہاں ان کی یاد تھی
بلکہ دوستوں کا نہیں ہونا
ان کے ہونے سے بڑھ کر تھا!!

مشکل صبر آزما سفر کے بعد
باقی ماندہ کشتیوں اور
سمندر کی ناقابل اعتبار طغیانوں کے بعد
اک سمندر اور آتا ہے
اور سب کچھ
بس کھویا جاتا ہے!!

بے حیا

ساحلی ہواؤں کی خنک سرشاری
اور اپنی مجتمع محرومیوں کے درمیاں
لہو ولعب کے اک سرشار لمحے میں
تپتے ہوئے، گلنار ہونٹوں کو چومتے ہوئے
اس نے میرے بازوؤں پر ہاتھ کیا پھیرا
کہ یکایک میرا وجود
سر تا سر
بھسم ہوتا چلا گیا!

مگر وہ جینا چاہتی تھی
اسے زندگی سے بے انتہا پیار تھا
بالآخر بے حیا، حرافہ

زندگی جیت گئی
اور راکھ اور بھسم اور
بھٹکاوے کو جھٹلاتے ہوئے
ایک بار پھر وہ
میرے مرگ آلود جسم سے لپٹ گئی!

گزراں

لمحۂ موجود کی مانند گذرنے والی ہر شئے گزر جاتی ہے
گھر کے درودیوار سے درّانہ گذرتی
نمکین ساحلی ہوا
اسٹیشن سے عجلت میں گذرتی
سیڑھیوں کے نشیب میں غش کھا کر
تیغ بے نیام سی گرتی
ادھیڑ چمرخ عورت
نل سے گذرتا ہوا پانی
برق رفتار گذرتی ہوئی یہ عمر گریزاں
خلا کی پہنائیوں میں بھٹکتے ہوئے
خوف زدہ ہذیانی
ہاتھ!
آنسوؤں سے پلوؤں کو سیراب کرتی
منکوحہ!
ٹرین اور پٹریوں کے درمیان لٹکا مسافر
باورچی خانے میں گرتے ہوئے

برتن کی آواز!

بدن کا تیاگ کرتے کپڑے

آنسوؤں اور محبت سے لبریز

روزِ موجود

اور محبوبہ!!

شفق اور رات میں تبدیل ہوتا

شاخوں میں قید

شام کا جھٹپٹا!

گزر جاتی ہے

بات، یاد، ملاقات

محبت، نفرت، مرگِ مفاجات

گزر جاتا ہے

دل اور دنیا سے گذرتا ہوا

کوئی سایہ

گزر جاتی ہے

خواب وخیال عدم سے گزرتی ہوئی

کوئی خواہش!!

روٹی اور بیاباں

روٹی پر ایسے ٹوٹتا ہوں
جیسے بیابان میں
شیر، ہرن پر!
لعاب، پسینہ، خون
اور غلاظت چباتا ہوا!
اُدھر میں
اِدھر، روٹی چباتا
روٹی کی محبت میں
خون کے آنسو روتا ہوا!
اُدھر ٹرینوں، بسوں کی پائیدانوں سے
رِستا ہوا
پسینہ،
اور آنسو!

پُر پیچ پٹریوں
کے بطن سے بلند ہوتی
فریاد کی بلند بانگ چیخ!
گونجتی ہوئی
بیابانوں سے
تحت الثریٰ تک!

کسی اور ہی ستارے
کسی اور ہی زمانے
کسی اور ہی آسمان
کسی اور ہی طلسم میں
کٹی میری راتیں
کسی اور ہی سیارے پہ
کٹے میرے دن!!

یک گونہ بے خودی

کڑیل دن جب
مدھم ہوتا
شام سے ہوتا
رات میں دھیرے دھیرے ڈھلتا
تھم جاتا ہے!

گھونٹ گھونٹ
آواز
مسلسل بھیگتی جاتی ہے
شبنم سے
چاند سے
آنسو اور فلک سے
فرقت سے
اور تاپ سے، تپ سے

حسرت سے

پرواز سے

بوئے زلف سے

انہد باجے کی آواز سے

اندھی ناف سے اٹھتی

آہ سے

دل کے تخت پہ بیٹھے

سنّاٹے سے!!

مے پرستِ عجَب

شراب پیتے ہوئے
میں غایت بد اخلاق و بد قمار
عمر بھر کی کمائی، پل میں گنوانے کو تیار
غمناک و سفاک ہوتا ہوں!
سنگ دل
قاتل دل کے ہمراہ
مسکراتا
خود سے، دنیا سے گذرتا
بتوں، مزاروں کو پوجتا
چاند کی کمان پر گردن جھکاتا
خود میں مبتلا
دنیا میں بھٹکتا ہوں!

شراب پیتے ہوئے
میں گھر کا بھیدی

اپنوں کا دشمن
دشمنوں کا دوست
آخری، فیصلہ کن وار کرتا ہوا
دشمن کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں
اور اسی کا ہو کر رہ جاتا ہوں!
طبل و علم کے ہمراہ
اپنی گڑگڑاتی ہوئی تیز رفتار،
لال موٹر سائیکل پر سوار
گھاٹیوں کو روندتا
گونجتی ہوئی دِشاؤں سے گذرتا ہوا
چیل کی مانند آسمانوں کو چیرتا
ہاتھیوں سا چنگھاڑتا
بھنوروں سا گنگناتا ہوں!
شراب پیتے ہوئے
میں خاصا مشکل و دشوار
خاصا آسان ہوتا ہوں
اکثر و بیشتر
غازی، شہید
اور
بھگوڑا!

دوستوں، دشمنوں
کے دلوں سے گذرتا
رحم کی بھیک مانگتا
فرشتوں، خداؤں اور شیطانوں
سے فریاد کرتا
جگنوؤں سا
جلتا بجھتا
پورا انسان ہوتا ہوں

ہر رات جیتا ہوں
ہر رات مر جاتا ہوں!!

امن کے پجاری

اُن کے بازوبند
بڑے دِل آویز تھے
گھونگھرالی زلفیں اور
کان کی بالیاں بھی!
تاب نہ لا سکے ہم اُن کی
کاٹ ڈالیں ہم نے
زبان میں حلول ہوتی
اُن کی نرم، شیریں
لویں!
عنابی رسیلے ہونٹ!
شہد سے لبالب
پستان!

ہم امن کے پجاری تھے
اور حسن کے بھی!!
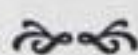
التباس

رنگ اور گلال سے بہتر تھا
فلمی ہولیوں میں لگایا گیا
رنگ اور گلال!
دوستی سے بہتر تھے
دوستی کے تذکرے
بوسے سے بہتر تھا
بوسے کا خیال!
عشق سے بہتر تھے
عشقیہ مضامین
انقلاب سے بہتر تھی
انقلابی شاعری
امید سے بہرحال بہتر تھی

امید کی بات!
شام، شفق اور قوس قزح سے
بہتر تھی
چمچماتے کاغذ پر مرصع
شام، شفق اور قوس قزح
کی تصویر!!!

نظم

بڑے مزے سے میں جی رہا تھا
کہ جیسے، یہ مومی جسم
خاک اور خوں کے بدلے
محض خیال سے گندھا تھا
کہ جیسے، یہ مشتِ خاک
گردش کناں بگولہ
خمیر آب اور گِل کے بدلے
دُرشت، بے روح
پتھروں سے گڑھا ہوا تھا
کہ جیسے، مرحوم روح میری
گئے زمانوں میں جی چکی تھی!
کہ جیسے، موجودہ وقت
کب کا گذر چکا تھا

نہ نرم رخسارِ دلربا تھے
نہ گرم بانہیں، نہ گرم سینہ
نہ سانس نازک، نہ قلبِ جویا
نہ سوختہ دل، جگر کا نوحہ
نہ کچھ تصوف، نہ کچھ تعصّف
نہ کچھ تجرّد، نہ کچھ تاسف
بدن، دماغ، گوشت، پوست، سارے
عناصر سنگ سے گڑھے تھے
میں لازوال اور بے عدم تھا!!
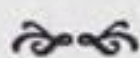
سرخروئی

حسبِ معمول
جمتی ہوئی میل کے ساتھ
مرتی ہوئی جلد کو
روز دھوتا رہا
روز
بڑھتے ہوئے ناخنوں
کی طرح
زندگی کو کترتا رہا

اب کھڑا ہوں
مقابل تمھارے
مجھ کو مارو
میرے دل پہ خنجر چلاؤ
نہاؤ ابلتے ہوئے موجِ خوں میں مرے
اپنے ہونے کا کچھ جشن
تم بھی مناؤ!

خدا (۱)

عدم کے پار
اک صحرائے لق و دق میں
اک وحشت کدے میں
لا کے پٹکا تھا خدا نے
اور مجھے
اس روح کے غربت کدے کی حکمرانی دی

اندھیرے میں وہاں میں تھا
میرا بے آسرا دل تھا!

بھٹکتا ہوں اندھیرے میں
میرے مولا
کوئی رستہ میرے مولا
کوئی چارہ میرے مولا!

قرار آیا مگر پھر
رفتہ رفتہ، ہیولوں نے
عجیب الصوت وصورت
خلقتوں نے شکل حاصل کی
اندھیروں میں میرے دل میں دھڑکتی
وہ محبت آشنا صورت
میری ماں تھی
مجھے مسحور کرتا، اجنبی سا اک ہیولا
باپ تھا میرا
یہ بستر تھا، زمیں تھی
فرش ٹھنڈا تھا
یہ گھر تھا، صحن تھا وہ، آسماں وہ
گھر کا دروازہ!
یہ آنگن، آگ وہ، اک پیڑ اور وہ میرا بکرا
یہ بھائی، دوست وہ
سورج وہاں، اک آگ کا گولہ
یہ مینڈک، سانپ، کیچڑ، کینچوا
برسات کا گڈھا
محبت، خون، آنسو اور پسینہ

تبسم، خواب، تارے، چاند، دنیا
فلک کے نیلے، نیلے، سات پردے
فلک کے سات پردوں سے پرے
وہ مالکِ دنیا!

وہ ربّ ماسوا
یکتا و قادر
خالقِ جن و بشر
دکھیوں کا رکھوالا
خدا اور
ناخدا!
نان و نمک
بھادوں کی راتوں کا سہارا!

خدا کو منقلب کرتا رہا
وہ دسترس سے دور میری
مجھ سے غافل تھا
(خدا کو منقلب کرنا کہاں آسان ہوتا ہے!)

کشادہ تھی جبیں بے نیاز ولالہ رخ
زلفِ پریشان، اَبروئے برہم
سراپا، سروقامت، کوہ پیا
دست وبازو انگلیاں، بے چین
عکسِ منتشر
اک رقص کرتا آبگینہ
پرتفکر
آسمانوں کے کناروں سے کناروں تک مسلط تیرگی میں
لالٹینوں کی لرزتی، بے وطیرہ روشنی میں
بے خیالی میں کہیں، کچھ ڈھونڈتا
اماں کے ہاتھوں سے
گلوری پان کی لیتا ہوا
صدیق
اسم بامسمیٰ
میرا ماموں تھا!

خدا آخر اُتر آیا
مرے دل میں!
کسی الہام کی صورت!!

ابھی پرسوں ہی یعنی جنوری کی
گیارہویں تاریخ کو
جب دن کے ساڑھے دس بجے تھے اور
صدی کا خاتمہ تھا
مرے خودساختہ اور خودتراشیدہ خدا کی
پہلی برسی تھی!

(ماموں مرحوم محمد صدیق کی یاد میں)

خدا (۲)

خدا کل رات آیا تھا
میری دہلیز پہ
مجبور و پابستہ
گرفتار محبت اور گم گشتہ

گجر دم، رات کے پچھلے پہر
جب نیند کے گنجان جنگل میں
بہت آوا گمن
گھمسان کا رن تھا
یکا یک اور بظاہر بے سبب
جھریا کے کانوں سے
خدا کی لاش برآمد ہوئی تھی
خدا کی لاش لاوارث پڑی تھی
ہر طرف اک قہر برپا تھا!

خدا، لیکن
مکاں کی کلفتوں سے دور، لا پروا
عدم کی خلوتوں میں غرق
ربّ ماسوا تھا

خدا پھر بھی خدا تھا!

خدا پھر بھی خدا تھا اور
مچلتا تھا!
مچلتی تھی جبین بے نیاز و لالہ رخ
زلف پریشاں، ابروئے برہم
دل یزداں میں ہر دم، یم بہ یم
طوفان برپا تھا
خدا
کرب خودی میں
ناچتا، گاتا، اچھلتا
کودتا، کرتب دکھاتا
مسخرہ تھا!
اک گداگر تھا!

خدا

بازار کے کچرے پہ بیٹھا
دارو اور سگریٹ پیتا تھا

سسکتا تھا خدا
بازاروں میں فریاد کرتا تھا

خدا بے چین تھا
برسوں سے میرے دل میں رہتا تھا!

خدا (۳)

بندگی، صبر و رضا
غیض و غضب، جرم و خطا
اپنی جگہ، لیکن خدا کا
اور میرا معاملہ
کچھ مختلف ہے!

خدا نالاں ہے مجھ سے
اور، خدا سے میں بھی عاجز ہوں!

(خدا!
لیکن اسے مجھ بن
کہاں کب چین آتا ہے)

زمانہ جو کہے، کہتا رہے

پر میں نے دل میں ٹھان رکھی ہے
خدا کو
بہر صورت
بہر قیمت
میں بچاؤں گا!

خدا کو
خنجروں سی تیز، نوکیلی
گھنیری داڑھیوں سے
خشمگیں نظروں
تقدس کی دہکتی آگ سے
تیر و تبر سے
تنگ سینوں کے جہنم سے بچاؤں گا

خدا سے اپنا وعدہ ہے!
خدا کو ایک دن میں
دن، دہاڑے
ناوا کھالی، ناگاساکی
کالاہانڈی، ہیرامنڈی
سونا گاچھی سے بچاؤں گا

خدا کو،

غازہ و بغداد، وِیتنام،

نیورمبرگ سے تاریک تر

گوری ضمیروں کے اجالوں

کالے افریقہ کی حبشی منڈیوں

کی دسترس سے دور لے جاؤں گا

بچاؤں گا

خدا کو، دربدر ہو جانے

دل سے دور

اور مجبور ہو جانے سے!

خدا، گر چہ میرے دل سے نکلنے پر

کسی بھی طور

آمادہ نہیں ہوتا

مگر میں نے بھی

دل میں ٹھان رکھی ہے

کہ ایک دن

جس کا وعدہ ہے

اسے میں اس کے

تاج وتخت وشان وتمکنت سے دور
پھینکو اور بیگو
اور ڈمرو کی عدالت سے
بچاؤں گا!!

خدا نالاں ہے مجھ سے
اور خدا سے
میں بھی عاجز ہوں!!!

ستم

ستم یہ ہی نہیں کہ
اس خدائی کارخانے میں
ہماری ہستیٔ موہوم
اک مجہول نقطے سے بھی کم تر تھی
کہ اپنے سارے دکھ
فرسودہ، گھٹیا تھے
تمنائیں خدائی خوف سے سہمی ہوئی
روحوں کا پرتو تھیں

ستم یہ بھی کہ
اب ایسے میں اور
اک بے بضاعت غم میں
اپنی جاں گھلاتا ہوں
تو غم کا کیا

میری جاں کیا؟

بِرہ

قبلہ و کعبہ
رِلکے کی صحبت میں لکھتا ہوں
کہ آج کی رات بھی وہ
نہیں آئی
کہ اس کے بغیر رات
رات نہیں رہتی
کہ اس کے بغیر
دن، دن نہیں ہوتا!
کہ اس کے بغیر
ہر رات
اک صلیب
ہر دن
ایک سنگین خیال ہے
کہ اس کے بغیر

ہر رات، بغیر صبح گذر جاتی ہے
ہر دن، بے وتیرہ گذر جائے گا

کہاں ڈھونڈوں
کہاں سے لاؤں اسے
کہ دنیا یکسر خالی ہے
اور دل کے گھارے
معدوم
اندھیروں میں
تابدار آنسوؤں اور
آبدار خنجروں کے درمیان
یکایک اِک دریچہ کھلتا ہے

اور ہاں!
میں یہاں ہوں
سنتے ہو!

معمول

گھر اور دفتر کے درمیان
اک ندی ہے
اک درخت!
جنھیں
بھولنا محال ہے!
اک چرچ
ویران و خانماں برباد
اک پُل
پُل، بہت سارے
ریل کی پٹریوں کو لانگھتے
درون شہر بسے شہروں کو
شہروں سے ملاتے
دوریوں کو مسمار کرتے ہوئے

گھر اور دفتر کے درمیان

حائل ہے

میری باقی ماندہ نیند

دماغ کے خلیوں میں سرسراتے

حافظے میں مدغم

موہوم سائے

مرد و زن

جن و ملائک

بھٹکتی ہوئی آتمائیں!

گرجتا، لہلہاتا

شارع عام سے گذرتا

جمِ غفیر شہر!

منزلوں کی راہ میں حائل

عبوری منزلوں پر

راہ تکتا، منتظر

انبوہ جانبازاں!

دریں اثنا

سرِ راہے

تن تنہا

بیٹھی
بلکتی، صبح دم
روتی ہوئی
عورت!!

دریں اثنا
زمین وزماں سے ماورا
پٹریوں کے دونوں جانب
تیز رفتار ٹرینوں سے
پکے ہوئے آموں کی مانند
گرتے ہوئے لوگ!!

بلیک ہول

دیر رات گئے جب
میں اپنی رکابی پر جھکا
کائنات کے کونوں کتروں میں
شکم کے جہنم کدے کے لیے
ایندھن کی تگ ودو میں بھٹکتا ہوں
بعد از تلاش بسیار،
کسی دور افتادہ سیارے سے
میسر ہوتی ہیں
گودے دار، رسیلی جڑیں
سبز ملائم پتیاں
اکارت محنت کا ماحصل
پس منظر غیب سے پھینکے گئے
فصل کے دانے!
قابل رحم حد تک کمزور و مجبور

کسی ذی روح کی
نرم و نازک ہڈیاں
لذیذ، ملائم گوشت!!

رکابی کے
اک سرے سے دوسرے سرے تک
بنتی، بگڑتی، پھیلتی
سکڑتی ہوئی میری کائنات
گم ہوئی جاتی ہے
شکم کے گہرے، تیزابی بلیک ہول میں

پس منظر کی تاریکی سے ابھرتی ہے
خون کی باریک سی لکیر
شوربے میں تحلیل ہوتی ہے
ایک فلک شگاف چیخ !
برپا ہوتا ہے کٹورے میں طوفان!
گم ہوئے جاتے ہیں
گہرے تیزابی بلیک ہول میں
جسم، خیال، جمال!
نوزائیدہ سورج کے ہمراہ

ازسرِنو تخلیق ہوتی
نئی مخلوق!
نئے بیکراں اندھیروں کی
نئی خوراک!

نظم

جب بھی دیکھا زمانے کو
گہری اداسی سے دیکھا!
کہ موجود تھی، کچھ تو
گہری اداسی سی
جلوہ بہ جلوہ و منظر بہ منظر

چھلکتی تھی کچھ
میرے دل سے
اور کچھ
اُس کی آنکھوں سے
لمحہ بہ لمحہ
و روزن بہ روزن!
کہ ہر پیش و پس سے پرے
ٹھوس جامد مکمل تھی

دل کی اداسی!
عجب کچھ نہیں، کہ
خوشی ارغوانی تھی
غم ارغوانی

عجب کچھ نہیں
جب بھی دیکھا
زمانے کو
گہرے تاسّف سے
گہری اداسی سے دیکھا
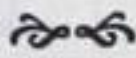
رنگ محل

سُدُ ور، رنگ محل کے راستے میں
آتی ہیں
کئی ندیاں، کئی دُرگم پہاڑ
گُم گُم
چار دِشاؤں سے گونجتی ہوئی
بھول بھٹکاوے بھری
گھاٹیاں !!
تیزی سے پیچھے چھوٹتی
دھرتی !
آگے پھیلتا
وِسمے، سَنشے اور دھو کے بھرا اسنسار !!
سُدُ ور رنگ محل سے بہت پہلے آتی ہے
اک ندی
آنسوؤں بھری

اک تیز، سنسناتی
گھاٹی
موت کی!!

کالے کوسوں دور
کالے جادو کا مارا
پار کرتا ہوں میں اسے
ہر روز
ہر رات!

کالے، کجرارے نینوں والی،
جادوگرنی کے دیش میں
ہر چیز پر اس کا ٹونا ہے
جادو، ٹونے کے بل پر
اس نے مجھے اپنے وَش میں کر رکھا ہے
اور بدل دیا ہے مجھے
ایک پیڑ میں
ایک پشو میں!

رنگ محل کے چومکھی دروازے پر کھڑا ہوں
جانے کب سے
ایک بے زبان پشو،
ایک بے صبر پیڑ!
سر پٹک پٹک کر تھک گیا
لیکن نہیں کھلتا
رنگ محل کا چومکھی
دروازہ
کسی طور
نہیں کھلتا !!!!

بلاعنوان

یہ بتلاؤ

انساں نے انساں کو بنایا

یا اللہ نے؟

شائید انساں نے انساں کو!

نہیں، غلط ہے!

بدھو ہو تم،

انساں آخر خود کو کیسے بنا سکتا ہے؟

اللہ نے ہی بنایا ہوگا!

اچھا، یہ بتلاؤ

خون کہاں سے آیا آخر،

کیا تاروں سے؟

تم کو پتہ ہے،

سامنے سے دیکھو تو تارے

چمکیلے اجلے لگتے ہیں

لیکن پیچھے سے دیکھو تو
سرخ ہیں سارے
خون ہے ان میں
میں بتلاؤں
اللہ تعالی نے تاروں سے خون لیا
اور اس میں تھوڑا صابن، تھوڑا پانی، تھوڑی جھاگ ملا کر
ڈھیروں سارا خون بنایا
پھر اس میں پنسل کو ڈبا کر
ہرن بنایا، شیر بنایا
پیڑ بنائے، پھول بنائے

مجھے بنایا، تمھیں بنایا
تم کو پتہ ہے؟
تم کو کچھ بھی پتہ نہیں ہے،

تم تو بالکل ہی بدھو ہو!

بلاعنوان

تم کتنے اچھے ہو
کتنا اچھا ہوتا
ہم تم دونوں بچے ہوتے
پیڑوں کے نیچے، ہم دونوں دوست
ساتھ میں کھیلا کرتے
پیڑ ہمیں جھک کر اپنی بانہوں میں لیتے
پتوں کے اوپر لے جاتے
پتوں کے بستر پہ سلاتے
اور ہم دونوں مزے، مزے سے
وہاں سے دنیا دیکھ دیکھ کر
خوش ہوتے!
اور تالی بجاتے!

اچھا ہوتا تھا نا ابو ؟

فانی

زری افواہ تھی فانی ہے دنیا

یہاں کچھ بھی نہ تھا فانی
یہاں موجود ہر شئے، ٹھوس، جامد
اور مکمل ہے، جسے محسوس کر سکتے ہیں
جس کی شکل وصورت، غرض وغایت ہے
اگر کچھ ماورائے شکل بھی ہو، اس کی ہیئت ہے
یہاں کچھ بھی نہیں فانی !!
کسی دن یوں ہی اور بیٹھے بٹھائے
ٹھسا ٹھس بھیڑ اور اُومَس بھرے ڈبے میں
یا خلوت کدے میں، آپ کو عرفان ہو گا
یقیناً سچ ہے، دنیا غیر فانی ہے!
کہیں جاتا نہیں کوئی
کوئی شے گم نہیں ہوتی

کہ کچھ ضائع نہیں ہوتا
کہ ہر جاتا ہوا موسم
دلوں میں ٹھہر جاتا ہے
نئے جذبے دلوں میں گھر بناتے ہیں
خزاں اپنی خزاں سامانیوں کے ساتھ
روحوں میں اترتا ہے تو پھر
جانے پہ آمادہ نہیں ہوتا
بہاریں جاتے، جاتے
نقش ایسے چھوڑ جاتی ہیں
کہ جب بھی ان کی چھب دیکھیں
دلوں میں پھول کھلتے ہیں
کہیں پہ کوئی موسم سنگ دل
ایسے ٹھہرتا ہے کہ پھر سبزہ نہیں اُگتا
مساموں میں بسی خوشبو
کسی بچپن کے منظر میں مقید ایسے ہوتی ہے
کہ بچپن، عطر کی شیشی میں اپنا گھر بناتا ہے

نری افواہ ہے فانی ہے دنیا!!

ٹریفک

کس نے دیکھا
تل چٹے کی آنکھ کے آنسو
ہُدہُد کے چونچوں کی ہلچل
چمگادڑ کی وحشت ناکی
مینڈک کے سینے کا درد!

چیونٹی کو پیروں کی خبر تھی؟
پھولوں کو خوشبو کا پتہ تھا؟
مچھلی کو پانی کی خبر تھی؟
مشک کو کیا نافے کا پتہ تھا
رات کو تاریکی کی خبر تھی
دن کو رخِ روشن کا پتہ تھا
نطق کو گویائی کی خبر تھی
خون کو مدغم، دھن کا پتہ تھا

دوا کو کیا تاثیر پتہ تھی

دارو کو جادو کا پتہ تھا

مشکیزے کو پیاس پتہ تھی

خنجر کو گردن کا پتہ تھا

سبزے کو دریا کی خبر تھی

آگ کو کیا حدت کا پتہ تھا

آدم کو پہلو کی خبر تھی

بیج کو کیا خوشے کا پتہ تھا

شمع کو ہستی کی خبر تھی

پروانے کو دل کا پتہ تھا

جیو، جیو

جینا ہی اگر لازم ٹھہرا

مرنا ہی اگر لازم ٹھہرا

جیو! مرو

بے خوف وخطر

بے شور وشغب

بے آہ وبکا

اور رستہ خالی کر جاؤ !!

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں جانے کب سے
بات اک کہنی تھی تم سے
بات
نازک، خوبصورت
مختصر سی
سُن کے جس کو
آنکھ بھر آئے
بات، جس کو سوچ کر
دل ٹوٹ جائے

جان لیوا، تیز، نشتر سی
سلونی بات
جس کو سن کے
جینے کی ہوس بڑھ جائے
جس کی یاد سے موت یاد آئے

بات، جس کے ذکر سے
دن گنگنائے
بات جس کے بعد سینے میں
محض ایک گونج رہ جائے!

سوچتا ہوں، جانے کب سے
بات اک کہنی تھی تم سے!!

معرض التوا

بہت سے کام باقی تھے
کسی سے بات کرنی تھی
کسی سے حال کہنا تھا
کسی کا حال سننا تھا
گذرتے راہ گیروں سے
نگاہیں چار کرنی تھیں
کسی سے جھوٹا پیمان وفا
پھر سے نبھانا تھا
کسی کے روکھے، سوکھے بالوں میں
انگلی گھمانی تھی
کوئی لے گنگنانی تھی
کوئی نوحہ سنانا تھا
کوئی سویا ہوا جادو
مجھے پھر سے جگانا تھا

اعزّہ، گم شدہ احباب، قبریں
فاتحے، لوبان، بھولے خط
پرانی غلطیاں، مٹ میلی تصویریں
سبھی سے از سر نو لو لگانی تھی

بہت سے کام باقی رہ گئے ہیں
ہمیشہ عادتاً، عجلت میں
اک الجھن میں رہتا ہوں!!

پابہ گل

بھور سَمئے
جب آئے تھے مہمان بہت سے
دل کے نگر میں
شور بہت تھا
آئی ایک آواز، یکایک
کوُک لگاتی
برماتی سی

بھور سَمئے
جب اس نے پکارا
سارے بندھن توڑ کے
میں دیوانہ بھاگا

تھے رستے جانے پہچانے
لیکن اس کے گھر کا رستہ
بھول چکا تھا

آدھی سوئی
آدھی جاگی
سونی سڑکیں
بستی کی نرجن خاموشی
تاروں سے خالی ہوتی
دھرتی کے بیچ
کھڑا تھا میں
اور
بیلا بجتی جاتی تھی!!

نان ونمک

مجھے اقرار ہے
میں سوچتا تھا کہ
یکایک بند آنکھیں کھولنے پر
نظم کاغذ پر پڑی ہو گی
زمانے میں
کوئی بھونچال ہو گا

اور دنیا مختلف اور
نت نئی ہو گی

بہت تدبیر کی
بسیار ترکیبوں کے باعث بھی
زمانہ ٹس سے مس نہ ہو سکا
لذت چشیدہ
امتداد وقت کا مارا
زمانہ

شاعروں، پیغمبروں
کی دسترس سے
دور تر تھا !

صحیفوں اور حدیثوں سے الگ
نان و نمک پر
لوٹتا ہوں اب
میری ہستی کا جو بھی ہو
خدا توفیق دے
نان و نمک دے
صبر دے
امید دے
اور سرکشی دے

خدا دنیا کو
اور مجھ کو
ذرا آسان کر دے!!

جبلّت
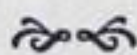
کشادہ اور مزین ہال میں بیٹھا ہوا
میں سن رہا تھا
گفتگوئے حل و عقدو
نظم و نسقِ کبریائی
یکایک اپنے درد انگیز دل کی
عافیت کوشی کی خاطر
اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی
نہ جانے کیسا منظر خونچکاں تھا
ثبت میرے دست و ناخن پر
مجھے اک جھرجھری سی آئی
میری آنکھ بھر آئی!

قصابوں کے محلے سے ذرا پہلے
بڑے تالاب والی لال بتّی پر کھڑا

مسکین سا اک شخص

اپنی گود میں اک میمنے کو سمیٹے

یوں کھڑا تھا

کہ جیسے اس کا بچہ ہو!

لال بتی پر کھڑا معصوم سا بے صبر سا
مسکین سا وہ شخص

رستہ پار کرنا چاہتا تھا

کوئی عجلت تھی اس کو

ضروری بات کوئی

منحصر تھی اس کے جانے پر

کوئی رازِ خفی

پوشیدہ پُراسرار رستوں

دست و ناخن سے گزرتا

کشادہ اور مزّین ہال تک پہنچا!

بدیہی طور پر
میں دیکھ سکتا تھا

کہ دونوں منظروں میں

مشترک تھی بات
کوئی قدر
کوئی جرم
اور کوئی جبلّت!
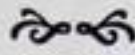
دیش اور دنیا سے گزرتے ہوئے

دیش اور دنیا سے گزرتے ہوئے
روز باضابطگی سے
دفتر جاتا ہوں
عمر اور صحت کے لحاظ سے
کم و بیش روز ہی
کم خوراکی کا عہد کرتا ہوا
نفسیاتی مریض سا
بہت زیادہ کھاتا ہوں!

کم کم بولتا ہوں
اظہارِ رائے سے
اصولی طور پر
اجتناب کرتا ہوں

بمشکل اور بس کبھی کبھار ہی سہی
دو چار گھونٹ پیتا ہوں

بیوی بچّوں سے چھپتا، چھپاتا
دو چار کش لگاتا ہوں
اِنٹرنیٹ اور اَنترَنگ گفتگو سے بچتا ہوا
فیض و فراق کو
وجے تندولکر اور یو۔ اننت مورتی کو
دل ہی دل میں یاد کرتا ہوں!

دیش اور دنیا سے گزرتے ہوئے
عادتاً ہوائی قلعے بناتا
خیالی دیوارِ چین کو بناتا
اور مسمار کرتا ہوں!

حد درجہ طاقتور لوگوں کے
زوال کے قصے گڑھتا
روز
حق اور باطل کا معرکہ
سر کرتا ہوں!!

دیر ہی لگتی ہے کتنی

دیر ہی لگتی ہے کتنی
آدمی سے لاش بننے میں
بدن کو خاک یا پھر راکھ
یا اک بھولی بسری یاد
یا اک ٹیس یا اک چیخ
اک فریاد بننے میں!

دیر ہی لگتی ہے کتنی
معرفت وجدان کے
سوہان بننے میں
معبدوں کے
قتل گاہ عام بننے میں!!!
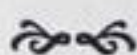
نظم

نبض شناس و محتاط بیوی پوچھتی ہے
اس قدر ہراساں ہراساں سے کیوں پھرتے ہو
انگلیوں کی ربڑ سے رگڑ رگڑ کر
چہرے اور ٹھوڑی کی نمایاں شکنوں کو
مٹاتا
پانچ سالہ بیٹا تاکید کرتا ہے

ابو! ابو!
مٹاؤ مٹاؤ
یہ لکیریں مٹاؤ!!!

کئی دن سے

کئی دن سے مرے دل میں ارادہ پل رہا ہے
عین ممکن ہے کہ
اک دن راستے میں آتے جاتے
روک لوں گا میں کسی کو اور کہوں گا
ارے بھائی سنو ذرا اک لحظہ ٹھہرو
کہاں جاتے ہو
کیسی دھن ہے تم کو
اس قدر بھی فکر فردا کیا؟
چلو فٹ پاتھ کے اس بنچ پر
کچھ دیر کو ہی بیٹھتے ہیں سانس لیتے ہیں
مجھے معلوم ہے جلدی میں ہو تم
مجھ کو بھی عجلت ہے
لیکن کیا کریں ہر شخص ہی جلدی میں ہے
فرصت میسر ہے کسے

اس بھیڑ اور بھگدڑ بھری
دنیا میں آخر!

مجھے معلوم ہے یوں تو
تمھارا حال اپنا حال
سارا حال ظاہر ہے
مجھے معلوم ہے
باتوں محض باتوں سے تو کچھ بھی تو نہیں ہوتا
نہ نل سے پانی آتا ہے
نہ گھر کا چولہا جلتا ہے
نہ بس کی بھیڑ کم ہوتی ہے
نہ دل کا درد ہی ہوتا ہے کم
لیکن غنیمت ہے کہ باتوں سے
تمھارا اور اپنا حال کہنے اور سننے سے
ذرا سا دل بہلتا ہے
تھوڑی تقویت ملتی ہے
جینے کے لیے
جیسی بھی ہے یہ زندگی
آسان لگتی ہے

مری مانو تو اگلے موڑ کے

اس چائے خانے میں

چل کر بیٹھتے ہیں

چائے پیتے ہیں

اگر تم شوق رکھتے ہو

تو اک سگریٹ پیتے ہیں

تمھارا موڈ ہو تو

جام بھی اک اک لگاتے ہیں

بھروسہ کیا زمانے کا

ہمارا سابقہ کب ہو

بہت سے غم ہیں دنیا میں

مجھے بھی ہیں

تمھیں بھی ہیں

اگر غم ہی مقدر ہے

چلو غم کی کہانی ہی سناتے ہیں

مجھے معلوم ہے

بھیڑ اُمس اور ٹریفک سے ٹھسا ٹھس شہر میں

تم بھی اکیلے میں اکیلا

شہر ہی سارا اکیلا ہے

مجھے تو بلکہ اکثر سوچ کر

یہ ہول آتا ہے
خدا کتنا اکیلا ہے!

اگر اب بھی نہیں منظور تم کو
تو چلو کچھ دور، تھوڑی دیر ہی
ہم ساتھ چلتے ہیں

تھوڑی بات کرتے ہیں

تم اپنی بس پکڑ لینا
میں اپنی ٹرین لے لوں گا
چلو جیسے تمھیں منظور ہو
کچھ دیر تک کچھ دور تک
ہم ساتھ چلتے ہیں
تمھاری طرح ہی
میں بھی اکیلا ہوں
نہتا ہوں!!
اگرچہ کہ
مسلماں ہوں!!

اکرام خاور کی شاعری اپنی غنائیت اور شعری حسن کے ساتھ قاری کو اپنی طرف بلاتی ہے اور جب وہ اپنے شوق فراواں کے ساتھ اس کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں زندگی کی شہ رگ سے ابلتا ہوا گرم سیال خون اور جھلسا دینے والی تپش دروں اس کا استقبال کرتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے لفظ میں زندگی ہوتی ہے، کاٹنے سے خون ٹپکتا ہے۔ اکرام خاور کی شاعری لفظ سے ٹپکا ہوا خون ہے جسے انہوں نے کاغذ پر اتار کر انہیں حیات جاودانی عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ اکرام خاور نے اپنے اندرون کے اس اضطراب واحتجاج کو جو مکروہات دنیا، سیاست کی عیاری، اقتداری جبریت اور کشاکش حیات سے نبرد آزما انسانی جہد کے پیدا کردہ ہیں، اپنی شاعری کا محور بنایا ہے، لیکن انہیں بخوبی معلوم ہے کہ شاعری کی اپنی ایک تہذیب ہے اور اس کی اپنی ایک خوش پوشی ہے جس کے کوروں کناروں اور درزوں سے زندگی کی بدہیئتی کی جھلک اس طرح دکھائی جا سکتی ہے کہ دیکھنے والا مضطرب ہو جائے اور سننے والے کی سماعت شور سے بھر جائے۔ اکرام خاور کی شاعری میں شور بھی ہے اور سرگوشی بھی۔ انہوں نے نظمیں نہیں لکھیں، لفظ میں زندگی پھونکی ہے۔ کشف وہنر کے اس مقام تک پہنچنے کے لئے وہ زندگی کے ان آزاروں سے قدم قدم گزرے ہیں جن سے کترا کر گزرنے کے بغلی راستے بھی موجود ہیں۔ لیکن جسے شاعری نے اپنے لئے چنا ہو وہ آزار ہی چنتے ہیں۔

اکرام کی نظموں میں غصہ ہے بلا کا غصہ، بے اطمینانی ہے شدید بے اطمینانی، احتجاج ہے، پرزور احتجاج، ایک صدا ہے، گھائل کر دینے والی صدا... اور ایک نغمگی ہے مسحور کر دینے والی نغمگی۔ اکرام کی نظم انہی عناصر کا آمیزہ ہے اسی لئے ان کی نظم سحر طراز بھی ہے اور منفرد بھی۔

خورشید اکرم

اکرام خاور امکانات کے شاعر ہیں۔ وہ کسی ایک جہان یا جہت کے شاعر نہیں، وہ جہات اور جہانوں کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم ایک زینہ دار منبر پر کھڑی نظر آتی ہے جو ایک دُھند بھری شام میں ایک انبوہِ کثیر سے ہم کلام ہے۔ راستے، منزلیں، سفر اور ان سب کی جستجو میں گرد، دُھند اور بے سمتی کا خوف ان کی نظموں کا پس منظر ضرور بنتا ہے لیکن ان کے راہ نوردی کے شوق کو مرنے نہیں دیتا۔ اُنھیں احساس ہے کہ اس جہان تیرہ وتار میں ہر موسم بڑی سخت جانی کا موسم ہوتا ہے جس کا ہر منظر دیدنی ہوتا ہے اور صبا دامن میں خون کی بو باس رکھتی ہے۔ اکرام خاور کی نظم بظاہر اوپری سطح پر تلاطم اور تموّج کا اندازہ ہونے نہیں دیتی لیکن اپنے اندرون میں احتجاج و اضطراب کا ایک ایسا الاؤ روشن رکھتی ہے جو دُور و نزدیک ہر چہرے اور ہر ذی حیات کو منور رکھتی ہے۔ ان کی اکثر نظموں کا سرچشمہ ان کے اندر کی برہمی، احتجاج اور اضطراب ہے۔ وہ زندگی کے سکوت سے زیادہ اس کے ہلچل کے قائل ہیں۔ وہ چاروں سمتوں میں پھیلی زندگی کی اسی ہلچل کا حصّہ بن کر آگہی اور عرفان کی منزلوں سے گزرتے ہیں۔ اپنے سچ کو پرکھتے ہیں اور زندگی کے جھوٹ کو کھرچ ڈالتے ہیں۔ اکرام خاور کی نظم اپنی رمزیت کے حسن اور ترشی ہوئی غنائیت کے بل پر موضوع اور مواد کی گراں باری کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ یہ شعری صنعت گری اُنھوں نے فیض سے سیکھی ہے۔ اکرام خاور کی نظم سرسری مطالعے کی بجائے سنجیدگی اور انہماک سے پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ نظم رمزیت اور اشاریت کے حسن سے مالا مال ہے۔

زبیر رضوی

اکرام خاور کی شاعری محبت اور شکست محبت، آلام روزگار اور خوش اوقاتی، شادکامی اور محرومی، انسانی دُکھ سکھ اور فطرت کی قہرمانیوں اور مہربانیوں، احتجاج اور غصّے اور رضا و خوشی، آزادی اور جبر، تبدیلی اور جمود، تنہائی اور بزم آرائی، ہنگامہ اور سکون اور خوش نمائی اور بدصورتی، غرض زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں سے ایک ایسے زندہ، حساس اور آزاد فکر شاعر کی حیثیت سے سروکار رکھتی ہے جس کی وابستگیوں کی شناخت اس کے باطنی سچائی پر اصرار اور احساس و فکر کی آزادی کے اعلان سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے دردمند اور صادق ضمیر شاعر کا تعارف نامہ ہے جو بہت سی شعری اور تہذیبی روایتوں کو اپنے اندر جذب کر کے پوری انسانی دنیا کے ساتھ اپنے ربط اور معنویت کی تلاش میں سرگرم ہے۔

عرفان صدیقی

آپ کو شاعری کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ پتہ نہیں آپ کس راستے کے کس موڑ پر کہاں نکل جائیں لیکن وفاداری بشرط استواری کے قائل رہے تو مجھے آپ سے بڑی اُمیدیں پیدا ہوگئی ہیں۔

محمود ایاز

Lahoo Se Chaand Ugta Hai (Urdu Poetry)
by Ekram Khawar

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

A for Arshia Publications